سرابوں کے صدف

خورشید رضوی

Portable Document Format: AQEEL ABBAS
www.facebook.com/mazeedkitaben/

سرابوں کے صدف

خورشید رضوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرابوں کے صدف

گردِ صحرا کے ہدف ہیں، ہم سرابوں کے صدف
ہم پہ دو آنسو بہا اے ابرِ نیساں ایک دن

والدہ صاحبہ کے نام

ترتیب

گزارشِ احوال خورشید رضوی ۱۱
مناجات ۱۵
نعت ۱۷

غزلیں:

1 نام ایسا ہے ترا، جب بھی زباں پر آئے ۲۱
2 بعض ایام ترے کھوج میں چلنا چاہے ۲۳
3 مجھ کو پیہم دل کے گہرے سلسلوں پر سوچنا ۲۵
4 جسم کی چوکھٹ پہ خم دل کی جبیں کر دی گئی ۲۷
5 پلکوں پہ اُس دیار کی مٹی اٹھاؤں میں ۲۹
6 ابھی لبوں پہ نہیں، ہے جو روشنی دل میں ۳۲
7 دل کی خلوت سے زباں تک کا سفر کس نے کیا ۳۳
8 پھر وہ گم گشتہ حوالے مجھے واپس کر دے ۳۵
9 نشانِ آب تو کیسا، سراب تک نہ دیا ۳۷
10 بھریں نہ وقت کے ہاتھوں جراحتیں تیری ۳۹
11 بساطِ وقت پہ صدیوں کے فاصلے ہم لوگ ۴۱
12 کوئی زمانہ بھی ہو، دکھ یہی ہیں ہونے کے ۴۳
13 وہی ہے آنکھ، وہی شب ہے، خواب بدلا ہے ۴۵
14 غم و سرور زمانے پہ کارگر کیا ہے ۴۷
15 اپنے باطن کے چمن زار کو رجعت کر جا ۴۸

16	بے بسی اس کو کہیں یا کہیں ذوقِ ایثار	۴۹
17	ہوائے بے طرب و فصلِ بے ثمر گزری	۵۱
18	کنجِ لب و رخسار و دہن بھی ہے بڑی چیز	۵۳
19	مسافت کٹ چکی کب کی مگر درپیش ہے دل کو	۵۴
20	دل پر اثر وہ حرفِ سادہ	۵۵
21	دل وقفِ جراحت ہے مگر رو نہیں سکتے	۵۷
22	بن میں جب آئے تو اپنی چاپ سے ڈرتے تھے ہم	۵۸
23	مژہ سے اشک ڈھلیں دل میں حسرتیں جاگیں	۵۹
24	سراغِ عمرِ رفتہ پا کے روئیں	۶۱
25	سب سخن میں بھی نہ کھلیں گے خزینے دل کے	۶۳
26	لوگ کیا بن جائیں باطن کا کہا مانیں اگر	۶۵
27	ظاہر میں سرد مہر سبک سر بھی رہے ہم	۶۷
28	وہ دن جب ایک ایک روش پر سو سو روشن آنکھیں تھیں	۶۹
29	جدا جو تم سے نظر ایک پل ہوئی ہوتی	۷۱
30	کچھ یقیں بھی آ چلا وہم و گماں کے ساتھ ساتھ	۷۳
31	کون دیکھ پائے گا جوہرِ نہاں دل کا	۷۵
32	پلٹ کے صبح کا سورج تو روز آئے گا	۷۷
33	ہوئے چمن میں مرے ترجماں گلاب کے پھول	۷۹
34	احساس کی تہوں میں جو موجِ قلق چلے	۸۱
35	ملتا ہی نہیں درد کا پیکر کوئی مجھ سا	۸۳
36	ہر چند انجمن میں ہوں تنہائیوں میں ہوں	۸۵
37	کچھ قطار اندر قطار ایسی ہوئی توقیرِ گل	۸۶
38	ترک کریں لب کھولنا	۸۷

39 کھوگئی دور کہیں بانگِ درا ڈھونڈ کے لائیں ۸۹

نظمیں:

1 نیلے پہاڑ ۹۳
2 ایک خواب ۹۵
3 پہچان ۹۷
4 درختو! ۹۸
5 جست ۱۰۰
6 طلوع ۱۰۲
7 آخری فیصلے کا عذاب ۱۰۴
8 سبزے سفید میں آنے کا غم ۱۰۶
9 چھٹی کے دن دفتر میں پھول ۱۰۷
10 دھند اچھی ہے ۱۰۹
11 شگوفے ۱۱۰
12 چند لمحے ۱۱۲
13 پا بہ گل سر بفلک ۱۱۳
14 دعائے نیم رنگ ۱۱۴
15 دل کو جانے ۱۱۶
16 چل اے دل آسماں پہ چل ۱۱۷
17 دل تو اب یہ چاہتا ہے ۱۱۸
18 ڈوبتے سورج کا خود کلامیہ ۱۱۹
19 قربِ قیامت ۱۲۰
20 فیصلہ ۱۲۱
21 محاسبہ ۱۲۳

22 ہمزاد ۱۲۵
23 اورینٹل کالج کیلئے ایک نظم ۱۲۸
24 اکیس اپریل ۱۳۲
25 عبدالنبی کوکب ۱۳۴
26 سلیم بے تاب ۱۳۶
27 ایک اچانک موت کا نوحہ * ۱۳۸
28 ایک پیدل چلنے والے دوست کا نوحہ ۱۴۰
29 نوحہ ۱۴۲
30 نوحہ ۱۴۴

گزارشِ احوال

''شاخِ تنہا'' کے بعد یہ میرا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت کی تحریک بھی میرے دوست جناب عبدالحمید چوہدری کی طرف سے ہوئی۔ ان کی سپاس گزاری میرا اولین خوشگوار فریضہ ہے۔ تاہم ان دنوں میں کچھ ایسی مصروفیات میں گھرا ہوا تھا کہ پرانے کاغذات کا جائزہ لینے اشعار کو یکجا نقل کرنے اور پھر انتخاب و ترتیب کے عمل سے گزرنے کیلئے میرے پاس وقت نہ تھا۔ اگر یہ کام میرے ذمے رہتا تو مسلسل التوا کا شکار ہوتا رہتا۔ میری اہلیہ نے یہ ساری مشقت اپنے ذمے لے کر اسے کمال حسن و خوبی سے نبھایا اور دس پندرہ روز کے اندر اندر پورا مسودہ اپنے سامنے پا کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ میرے بیٹے عامر نے بھی اس کام میں کچھ ہاتھ بٹایا۔ میں ان دونوں کا ازحد ممنون ہوں

اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی' جن میں ''شاخِ تنہا'' سے پہلے کی کاوشیں بھی شامل ہیں۔ تاہم مجموعے کی ترتیب میں ترتیبِ زمانی کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ نظموں کا آخری حصہ ان تاثرات پر مشتمل ہے جو کائنات کی جابر حقیقت' موت' انسانی دل و دماغ پر مرتب کرتی ہے۔ یہ نوحے کسی بھی موت پر کسی بھی انسان کے تاثرات ہو سکتے ہیں۔ تاہم خاص میرے حوالے سے یہ جن صدموں کے آئینہ دار ہیں ان کی مختصری صراحت بھی نامناسب نہ ہوگی۔

''اکیس اپریل'' کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہ نوحہ ہے بھی نہیں' بلکہ تسخیرِ مرگ کی ایک مثال ہے

قاضی عبدالنبی کوکب جواں سال ہونے کے باوصف' دینی حلقوں میں بڑے ثقہ قسم کے عالم دین تھے' لیکن میرے لیے وہ ایک بے تکلف دوست کی حیثیت رکھتے تھے۔ عربی فارسی کے عالم' ادب کے خوش ذوق قاری' خود ایک خوش فکر شاعر اور سب سے بڑھ کر' ایک نہایت درد مند انسان۔ مسلسل بیس برس کے لگ بھگ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے ایک خاموش گوشے میں بیٹھ کر وہاں کے عربی فارسی مخطوطات پر تحقیق کی اور ان کی ایک تفصیلی فہرست شائع کی۔ اور بھی بہت سی تصانیف ان کے قلم سے یادگار ہیں۔ آخر میں وہ اورینٹل کالج میں عربی کے استاد ہو گئے تھے' اور یہاں ان کے علم و فضل کا صحیح مصرف تھا۔ لیکن 19 جنوری 1978ء کو سڑک پار کرتے کرتے وہ عرصۂ حیات ہی کو پار کر گئے۔

سلیم بے تاب ''لمحوں کی زنجیر'' کے مصنف' فیصل آباد کے معروف جواں سال شاعر لاہور سے گھر آنے کیلئے ویگن پر سوار ہوئے لیکن آسمانوں کا سفر راہ میں آن پڑا۔ میری ان سے دو چار مختصر سی ملاقاتیں تھیں لیکن میں ان کی سادہ و پر خلوص شخصیت کو فراموش نہیں کر سکا۔

''ایک اچانک موت کا نوحہ'' اور ''ایک پیدل چلنے والے دوست کا نوحہ'' سید ظہیر الحق ساقی الحسینی سے متعلق ہیں۔ وہ میرے رفیقِ کار تھے۔ ایسے صاحب علم' غیور' وضعدار اور عالی ظرف انسان بہت کم میری نگاہ سے گزرے ہیں۔

میری والدہ کو شعر سے ایک فطری اور بہت گہرا لگاؤ ہے۔ وہ بتایا کرتی ہیں کہ اوائل عمر ہی سے ان کی یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے اپنے گھر میں بھی کوئی فرد شعر کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے میری شعری کاوشیں ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کی ایک صورت ہیں۔ میں نے اس مجموعے کا انتساب انہی کے نام کیا ہے اور اس کا اختتام ان کے اور اپنے ایک مشترک دکھ پر کیا ہے کہ اس حوالے سے وہ میرے اس ہدیے کو اپنے دل کے قریب محسوس کر سکیں گی۔ میری مراد آخری دو نوحوں سے ہے جو میری مرحومہ خالہ کی اچانک وفات کا بے ساختہ ردعمل ہیں۔'

جناب ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی قیمتی رائے سے نوازا اور حافظ محمد سعید صاحب کا دوستانہ تعاون مجھے حاصل رہا۔ میں ان دونوں حضرات کا تہ دل سے سپاس گزار ہوں۔

مجموعے کی ترتیب اگرچہ بڑی تیزی سے عمل میں آ گئی تھی تاہم اس نوع کے کاموں

میں ’’ وے افتاد مشکل ہا ‘‘ کا مرحلہ ہمارے ہاں قریب قریب ناگزیر ہے۔ ڈیڑھ سال کے قریب مختلف وجوہ سے مختلف مراحل پر یہ کام معلق رہا ‘ تا آنکہ محمد حسن واسطی صاحب اس کی اشاعت کے خیال کو ایک حقیقت میں تبدیل کر سکے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

خورشید رضوی

بارِ دگر

’’ سرابوں کے صدف ‘‘ ۱۹۹۵ء میں دوسری بار شائع ہوئی اور اب ایک عرصے سے دستیاب نہیں۔ تیسری کے بعد اب یہ اشاعت برادرِ عزیز صفدر حسین صاحب کی توجہ اور اہتمام کے نتیجے میں آپ کے سامنے آ رہی ہے۔ میں ان کا ممنون اور اُن کے لئے دعا گو ہوں۔

خورشید رضوی

مناجات

کتنا احسان ہے تیرا، یہ عنایت کرنا
تجھ کو منظور ہوا مجھ سے محبت کرنا

حسرتوں کا بھی کوئی روز جزا ہے کہ نہیں
میری حسرت میں تو تھا تیری اطاعت کرنا

حق نہیں ہے نہ سہی تیری سخاوت کے حضور
ہے مرا کام تمنا کی جسارت کرنا

جسم زندانِ عناصر میں گرفتار سہی
تو بہر حال مرے دل پہ حکومت کرنا

بوند ہوں کامِ صدف تک مجھے پہنچا دینا
شورشِ موج میں خود میری حفاظت کرنا

دل کو دریوزۂ کثرت میں نہ اُلجھا دینا
مجھ کو ہر سانس میں تنہا تو کفایت کرنا

نعت

شان اُنؐ کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

سونپ دیجے دیدۂ تر کو زباں کی حسرتیں
اور اِس عالم میں جتنا بَن پڑے رو جایئے

یا حصارِ لفظ سے باہر زمینِ شعر میں
ہو سکے تو سرد آہوں کے شجر بو جایئے

اے زہے قسمت کسی دِن خواب میں پیشِ حضورؐ
فرطِ شادی سے ہمیشہ کے لئے سو جائیے

اے زہے قسمت اگر دشتِ جہاں میں آپؐ کے
نقشِ پا پر چلتے چلتے نقشِ پا ہو جائیے

غزلیں

○

نام ایسا ہے ترا، جب بھی زباں پر آئے
دل میں اک خنجرِ تصدیق اترتا جائے

زندگی دھوپ بڑھانے لگی آئینوں سے
میں چلا جب تری دیوار کے سائے سائے

اے صبا! میں تری تاثیرِ نفس تب جانوں
جب کسی دن مرے ماتھے کی گرہ کھل جائے

میں زمیں پر ہی رہوں اور اُفق سے جھک کر
آسماں آپ مجھے ہاتھ لگانے آئے

غنچہ خاموش تھا جب تک، تو مہک اُس کی تھی
اب ہوا کی ہے، جہاں چاہے وہاں پھیلائے

تھی یہاں تو وہی پانی کی تجارت اچھی
آنکھ سے کس نے کہا تھا کہ لہو برسائے

جمع احباب ہوئے وقت کو زنجیر کرو
عمر کٹ جائے، یہ لمحہ نہ گزرنے پائے

○

نبضِ ایّام ترے کھوج میں چلنا چاہے
وقت خود شیشۂ ساعت سے نکلنا چاہے

دستکیں دیتا ہے پیہم مری شریانوں میں
ایک چشمہ کہ جو پتھر سے ابلنا چاہے

مجھ کو منظور ہے وہ سلسلۂ سنگِ گراں
کوہکن مجھ سے اگر وقت بدلنا چاہے

تھم گیا آ کے دمِ بازپسیں لب پہ وہ نام
دل یہ موتی نہ اگلنا نہ نگلنا چاہے

ہم تو اے دورِ زماں خاک کے ذرّے ٹھہرے
تو تو پھولوں کو بھی قدموں میں مسلنا چاہے

کہہ رہی ہے یہ زمستاں کی شبِ چار دہم
کوئی پروانہ جو اس آگ میں جلنا چاہے

عمر اسی کی ٹھوکریں کھانے کے عمل میں گزری
جس طرح سنگ ڈھلانوں پہ سنبھلنا چاہے

صبح دم جس نے اُچھالا تھا فضا میں خورشید
دل سرِ شام اُسی بام پہ ڈھلنا چاہے

○

مجھ کو پیہم دل کے گہرے سلسلوں پر سوچنا
آدمی سے آدمی کے رابطوں پر سوچنا

عطر کیسے ہو رہا ہے خاکِ تیرہ سے کشید
کُنجِ گُل میں بیٹھنا اور خوشبوؤں پر سوچنا

رنگ آمیزی ہوا میں تتلیوں کی دیکھنا
دور تک ان سُو بہ سو اُڑتے گُلوں پر سوچنا

آسماں پر آتی جاتی بدلیوں کو دیکھ کر
اپنے اندر سے گزرتے بادلوں پر سوچنا

دوستوں کی آنکھ سے بہتی نمی کو پونچھ کر
اپنی نس نس میں مچلتے آنسوؤں پر سوچنا

کوئی کر پائے تو ہے یہ بھی بڑی ہمت کا کام
مرقدوں پر بیٹھ کر گزرے ہوؤں پر سوچنا

دل کی وادی سے ورے سیلِ سماعت روک کر
جلوتوں کی ہاؤ و ہو میں خلوتوں پر سوچنا

زیست کے بنتے بگڑتے مسئلوں کے درمیاں
دل کو جو درپیش ہیں اُن مرحلوں پر سوچنا

مختصر ہے کس قدر خورشید میری سرگزشت
ناقصوں کی صحبتیں اور کاملوں پر سوچنا

○

جسم کی چوکھٹ پہ خم دل کی جبیں کر دی گئی
آسماں کی چیز کیوں صرفِ زمیں کر دی گئی

میرے ہاتھوں کی لکیروں ہی میں خم رکھا گیا
میری اُفتادِ طبیعت ہی غمیں کر دی گئی

کل مری بے خواب آنکھوں کے مقابل رات بھر
نقش تاروں میں وہ چشمِ سرگیں کر دی گئی

خون رُلواتی رہی گزرے زمانوں کی شبیہ
تھک گئیں آنکھیں تو غرقِ ساتگیں کر دی گئی

کھوٹ سونے کے تسلسل میں کہیں آئی ضرور
یوں عبث تو سعی دل باطل نہیں کر دی گئی

تلخ کر لیتا ہوں ہر لذت کی شیرینی کو میں
کیوں تنگ میری نگاہِ پیش بیں کر دی گئی

نقش آخر دل سے اُس روئے حسیں کا مٹ گیا
ختم آخر صحبتِ نام و نگیں کر دی گئی

○

پلکوں پہ اُس دیار کی مٹی اُٹھاؤں میں
آنکھوں سے اُس کی خاکِ قدم کو لگاؤں میں

یہ بات کیا ہوئی کہ جسے زندگی کہوں
جب جان پر بنے تو اُسے بھول جاؤں میں

کوہِ گراں ہوں مجھ کو اگر آزمائے تو
ریگِ رواں ہوں خود کو اگر آزماؤں میں

کہتا ہے آئنہ کہ کبھی میرے رُو برو
آئے تو تجھ کو تیری شکستیں گناؤں میں

میں اس لیے نہیں کہ تجھے شادماں رکھوں
میری عطا یہ ہے کہ ترا دل دکھاؤں میں

بو جاؤں بیج کے زہر کی تلخی کا ذائقہ
جب اُس میں پھل لگے تو تجھے یاد آؤں میں

میرے کہے کو یاد کرے اور رو پڑے
دِل میں ترے وہ پھانس سی چھوڑ جاؤں میں

یہ دشتِ بے کسی ہی سہی پھر بھی اے جنوں
جو تجھ سے اُٹھ سکے وہ قیامت اُٹھاؤں میں

اے روشنیِ طبع بہت بے اماں ہے تو
کن جنگلوں میں تیرے شرارے اُڑاؤں میں

بولوں تو بازگشت برابر کا دے جواب
ایسا پہاڑ ہو تو غمِ دل سناؤں میں

عمرِ گریز پا مجھے اتنا تو دے فراغ
جو کچھ کہ جاننا تھا یہاں جان جاؤں میں

ہاں میرے غم میں خود کو خزاں کر لے اے بہار
شاید کہ اب چمن میں پلٹ کر نہ آؤں میں

وہ کوکبِ☆ سحر کہ جو مٹی میں جا ملا
خورشید اب کہاں سے اُسے ڈھونڈ لاؤں میں

☆ عبدالغنی کوکب (مرحوم)

○

ابھی لبوں پہ نہیں، ہے جو روشنی دِل میں
ترش رہی ہے ابھی لفظ کی کنی دِل میں

کوئی نہیں ہے جو اِن سیپیوں کو کھول سکے
پڑے ہیں لاکھ سخن ہائے گفتنی دِل میں

یہ مجھ سے برسرِ پیکار خلوتوں میں مری
چھپا ہے کون یہ تلوار کا دھنی دِل میں

فغاں، کہ ٹال گئے ہم وہ ایک فرصتِ مرگ
تمام عمر رہی جس کی جانکنی دِل میں

سرابِ علم و ہنر پر نہ بھولنا خورشید
جس آدمی کے نہ دیکھو فروتنی دِل میں

○

دل کی خلوت سے زباں تک کا سفر کس نے کیا
درد کے عکسِ گریزاں کو امر کس نے کیا

مسکرا کر زخم کھانے کی بنا کس نے رکھی
تلخیوں کو زیست سے شیر و شکر کس نے کیا

تم نے یا ہم نے لکھے پیغام فصلِ گل کے نام
خوشبوؤں کو گلستاں میں نامہ بر کس نے کیا

کیا یہ اس بے دست و پا اندھے صدف کا کام ہے
بوند کو پانی کی ظلمت میں گہر کس نے کیا

کس نے ماہِ نو کی ڈالی پاؤں میں بیڑی مرے
شام کے منظر کو میرا ہم سفر کس نے کیا

پیڑ کو کس نے ہلایا ہے کہ اُڑتے ہیں پرند
ذہن میں ٹھہرے ہوؤں کو در بدر کس نے کیا

زلزلوں نے یا جبیں گھستے ہوئے سیلاب نے
رفتہ رفتہ گھر کی بنیادوں میں گھر کس نے کیا

کس نے چھوڑا آسماں تک لا کے پتھر کی طرح
میں پرندہ تھا مجھے بے بال و پر کس نے کیا

✓

○

پھر وہ گم گشتہ حوالے مجھے واپس کر دے
وہ شب و روز وہ رشتے مجھے واپس کر دے

آنکھ سے دل نے کہا رنگِ جہاں شوق سے دیکھ
میرے دیکھے ہوئے سپنے مجھے واپس کر دے

میں تجھے دوں تری پانی کی لکھی تحریریں
تو وہ خوںناب نوشتے مجھے واپس کر دے

میں شب و روز کا حاصل اُسے لوٹا دوں گا
وقت اگر میرے کھلونے مجھے واپس کر دے

مجھ سے لے لے صدف و گوہر و مرجاں کا حساب
اور وہ غرقاب سفینے مجھے واپس کر دے

نسخۂ مرہمِ اکسیر بتانے والے
تو مرا زخم تو پہلے مجھے واپس کر دے

ہاتھ پہ خاکۂ تقدیر بنانے والے
یوں تہی دست نہ در سے مجھے واپس کر دے

آسماں! صبح کے آثار سے پہلے پہلے
میری قسمت کے ستارے مجھے واپس کر دے

میں تری عمرِ گزشتہ کی صدا ہوں خورشید
اپنے ناکام ارادے مجھے واپس کر دے

○

نشانِ آب تو کیسا، سراب تک نہ دیا
وصال کیا، شرفِ انتساب تک نہ دیا

نہ جانے حسرتِ خوش فہم کس خیال میں ہے
وگرنہ اُس نے حسیں کوئی خواب تک نہ دیا

اُسے خبر بھی نہیں اور دل میں بستا ہے
وہ اجنبی جسے خط کا جواب تک نہ دیا

خود اپنے آپ میں گھُٹ گھُٹ کے مر گئی خوشبو
صبا کو سنگ نے رستہ گلاب تک نہ دیا

نگاہِ یار سے خوں کا قصاص کیا لیتے
نگاہِ یار نے خوں کا حساب تک نہ دیا

سحر تو خیر کہاں، تیرگی تو پھیکی ہو
فلک نے مہر کجا، ماہتاب تک نہ دیا

سمندروں سے وہ شبنم بھی اُٹھ گئی خورشیدؔ
کہ تشنگاں کو کسی نے حباب تک نہ دیا

◆

بھریں نہ وقت کے ہاتھوں جراحتیں تیری
رکھیں سنبھال کے دل نے امانتیں تیری

چھپا کے تجھ سے کہاں اپنے روزشب لے جاؤں
جہانِ نور ترا، اور ظلمتیں تیری

بچھڑ کے تجھ سے ملا عمر بھر کا سناٹا
بنا گئیں مجھے تنہا، رفاقتیں تیری

تو ہے وہ فاتحِ عالم کہ ایک دُنیا نے
شکست کھا کے سراہی ہیں ہمتیں تیری

ترے نقوشِ قدم سے بہار تھی ان کی
ہیں منتظر مرے دل کی مسافتیں تیری

کہاں ہے شامِ تمنا! ملاحتوں کا وہ رنگ
کہاں ہیں صبحِ تصور! صباحتیں تیری

دلِ حزیں! تری چوکھٹ پہ عمر کون گنوائے
کبھی سمجھ میں نہ آئیں ضرورتیں تیری

ازل سے شیشۂ گردوں میں ریت چلتی ہے
کبھی شمار میں آئیں نہ ساعتیں تیری

تو میری شرکتِ ہستی کہیں قبول تو کر
تمام رنج مرے سب مسرتیں تیری

○

بساطِ وقت پہ صدیوں کے فاصلے ہم لوگ
کنارِ شام و سحر میں کہاں ڈھلے ہم لوگ

نہ کارواں نہ مسافر مگر جرس نہ تھمی
نہ روشنی نہ حرارت مگر جلے ہم لوگ

مقام جن کا مؤرخ کے حافظے میں نہیں
شکست و فتح کے مابین مرحلے ہم لوگ

نمودِ جسم کی شوریدہ خواہشیں دنیا
فشارِ رُوح کے نادیدہ ولولے ہم لوگ

نہ جانے کب کوئی کروٹ ہمیں جگا ڈالے
زمیں کے بطن میں خوابیدہ زلزلے ہم لوگ

فسادِ کوہکنی ، حیلہ ہائے پرویزی
ہزار رنگ کے کانٹوں میں آبلے ہم لوگ

امیرِ شہر کی موٹی سمجھ میں کیا آتے
ضمیرِ دہر کے نازک معاملے ہم لوگ

ہجومِ سنگِ اذیت میں سر جھکائے ہوئے
رواں ہیں لے کے مشیت کے قافلے ہم لوگ

زباں بریدہ و بے دست و پا سہی لیکن
ضمیرِ کون و مکاں ہیں برے بھلے ہم لوگ

○

کوئی زمانہ بھی ہو، دکھ یہی ہیں ہونے کے
ملیں گے خاک میں، ہوں لاکھ آپ سونے کے

حباب ہوں مرا مسکن ہی سطح آب پہ ہے
مجھے تو سات سمندر نہیں ڈبونے کے

مری سرشت میں تھی زندگی سے بیزاری
ترے ستم تو بہانے تھے ہاتھ دھونے کے

اِدھر یہ کانپتے ہاتھ اور یہ ڈگمگاتے قدم
اُدھر وہ دل کے عزائم پہاڑ ڈھونے کے

نہ بھولتے ہیں وہ منظر نہ یاد آتے ہیں
عجیب تھے وہ سفر جاگتے میں سونے کے

یہی زمیں ہے تو پھر فصل کاٹنا کیسا
کٹیں گے ہاتھ گنہگار بیج بونے کے

نئے علوم خلاؤں میں راج کر لیں گے
مگر یہ دل کے سمندر نہیں بلونے کے

○

وہی ہے آنکھ، وہی شب ہے، خواب بدلا ہے
مٹا کہاں ہے ابھی اضطراب، بدلا ہے

نشہ فراق کا برسوں میں جا کے راس آیا
کشاں کشاں مرا ذوقِ شراب بدلا ہے

بدل گیا ہے زمانہ بہت، پہ کیا بدلا
یہی کہ حدِّ نظر پہ سراب بدلا ہے

اسے کبھی، کسی کروٹ، نہ مل سکا آرام
سدا عذاب سے دل نے عذاب بدلا ہے

پلٹ پلٹ کے نئی اپنی بازگشت آئی
سوال کا مرے پیہم جواب بدلا ہے

بدل رہا ہے زمانہ لباس بے آہٹ
کہ دستِ شاخ میں جیسے گلاب بدلا ہے

حیات و موت ہماری نظر میں کچھ بھی نہیں
بس اس قدر کہ ہوا نے حباب بدلا ہے

○

غم و سرور زمانے پہ کارگر کیا ہے
بہت بسے، بہت اُجڑے مگر اثر کیا ہے

میں چلتا جاتا ہوں تحلیل ہوتا جاتا ہوں
کڑکتی دھوپ میں شبنم کا یہ سفر کیا ہے

زمیں ہوں تو خزانے کہاں گئے میرے
درخت ہوں تو مری شاخ کا ثمر کیا ہے

ہزار آئنوں میں جیسے اِک کرن محبوس
نظر ہی کیا ہے مری، نقطۂ نظر کیا ہے

وہ آگ ہے کہ جو اُڑتا ہے جل کے گرتا ہے
فضا کا روگ ہے تقصیرِ بال و پر کیا ہے

◆

اپنے باطن کے چمن زار کو رجعت کر جا
دیکھ اب بھی روشِ دہر سے وحشت کر جا

اپنا چلتا ہوا بُت چھوڑ زمانے کے لیے
اور خود عرصۂ ایّام سے ہجرت کر جا

مانتا جس کو نہ ہو دل وہ عمل خود پہ گزار
جو فسانہ ہو اُسے چھو کے حقیقت کر جا

سر کٹایا نہیں جاتا ہے تو کٹ جاتا ہے
بات اِتنی ہے کہ اس کام میں سبقت کر جا

جاں سے آگے بھی بہت روشنیاں ہیں خورشید
اک ذرا جاں سے گزر جانے کی ہمت کر جا

○

بے بسی اس کو کہیں، یا کہیں ذوقِ ایثار
اپنی دھڑکن کو نمایاں نہیں کرتا دلِ زار

زیست کے چار طرف سنگِ خموشی کی فصیل
کسی جانب نہیں کھلتا کوئی بابِ اظہار

لڑکیاں قید ہیں پھیلی ہوئی دیواروں میں
شاہزادہ کوئی آیا نہ کوئی شاہسوار

مکڑیاں تان کے بیٹھی رہیں روزنِ دل کے
کوئی سورج کی کرن ان سے نہ گزری زنہار

گونج کا زنگ لگا جاتا ہے محرابوں کو
لوٹ لوٹ آتی ہے محرومِ سماعت گفتار

ہے وہی طوقِ گلو اور وہی زنجیرِ قدم
اور اُسی قوسِ مکرّر پہ رواں ہے پرکار

جانے اِس حبس میں کب موجِ ہوا نقب لگائے
جانے کب میان کی ظلمت سے رہا ہو تلوار

○

ہوائے بے طرب و فصلِ بے ثمر گزری
ترے بغیر گزرنا ہی کیا، مگر گزری

شریکِ شورشِ دنیا ہوں اور سوچتا ہوں
کہ شمع بزمِ طرب سے بھی چشم تر گزری

نہ تھی پہاڑ سے کچھ کم مگر مصیبتِ عمر
ترے خیال میں گزری تو مختصر گزری

کوئی بھی کام نہ آیا شکستہ بالی میں
صبا بھی شاخِ نشیمن کو کاٹ کر گزری

مری نگاہ نے خوابوں میں خود کو پہچانا
کہ جاگتے میں جو گزری وہ بے بصر گزری

زمانے بھر سے الگ ہو کے میں اُدھر کو چلا
جدھر جدھر سے مرے دل کی رہ گزر گزری

○

کنجِ لب و رخسار و دہن بھی ہے بڑی چیز
ظاہر کے مظاہر کی پھبن بھی ہے بڑی چیز

ہر سانس ترے قرب کی لذت سے ہے سرشار
اب روح نے مانا کہ بدن بھی ہے بڑی چیز

کچھ گل ہی پہ موقوف نہیں سحرِ بہاراں
مہکی ہوئی یہ خاکِ چمن بھی ہے بڑی چیز

اخلاص ترے دل میں نہیں بھی ہے تو کیا ہے
ملنے کا یہ بے ساختہ پن بھی ہے بڑی چیز

ہر چند ترے روپ کا اک عکس ہے لیکن
اے دوست مرا رنگِ سخن بھی ہے بڑی چیز

○

مسافت کٹ چکی کب کی، مگر درپیش ہے دل کو
سفر کے بعد اب یادِ سفر درپیش ہے دل کو

قدم گو کارواں کے ساتھ ہیں پامال راہوں پر
مگر سب سے الگ اِک رہ گزر درپیش ہے دل کو

نہ کر دیں نیم شب سے نیم جاں بے تابیاں اپنی
سوادِ شام سے شوقِ سحر درپیش ہے دل کو

وہ منظر ایک لمحے کو رُکا پیشِ نظر لیکن
وہ اک لمحہ جو تھا اب عمر بھر درپیش ہے دل کو

ہمیں جانے کہاں لے جائے گی آوارگی اِس کی
ہوا کی راہ، بادل کا سفر درپیش ہے دل کو

○

دل پر اثرِ دو حرفِ سادہ
افسون و طلسم سے زیادہ

دیکھا جو تجھے تو ہو گیا موم
پتھر پہ لکھا ہوا ارادہ

دل اُس کی طلب میں دشت در دشت
دن رات، عبث ہے پر کشادہ

واپس نہ کبھی پلٹ کے آیا
لمحہ، شطرنج کا پیادہ

بے صرفہ ہیں منتشر جہاں میں
بے بادہ و جام، جام و بادہ

ہے کوئی کہیں، کوئی کہیں ہے
دشوار ہے ربط و اِستفادہ

ہیں صاحبِ عزم رہنِ آلام
جو چین سے ہیں وہ بے اِرادہ

القصہ ہے تار تار ہر سو
بکھرا ہوا زیست کا لبادہ

اُمید ہے اور رُو برو ہے
اِک لشکرِ بیم اِیستادہ

خورشید ہے اور شرق تا غرب
پھیلا ہوا آسماں کا جادہ

○

دل وقفِ جراحت ہے، مگر رو نہیں سکتے
دامن میں بہت بیج ہیں پر بو نہیں سکتے

کیا خوفِ زیاں اُن کو جو خود کھوئے گئے ہوں
اب اِس سے سوا اور تو کچھ کھو نہیں سکتے

اِس دور میں وہ لوگ کہاں جائیں خدایا
جو کانِ نمک میں بھی نمک ہو نہیں سکتے

ہر شخص کے ہاتھوں پہ ہیں پتھر کی لکیریں
جو کچھ کہ ہوا نقشِ جبیں دھو نہیں سکتے

خورشید ہے سرتا بہ قدم زخم و لیکن
ہم چھوڑ بھی اِس شخص حزیں کو نہیں سکتے

○

بن میں جب آئے تو اپنی چاپ سے ڈرتے تھے ہم
شہر میں رہ کر بنوں کی آرزو کرتے تھے ہم

اب فرشتوں سے بھی مل کر سوئے ظن جاتا نہیں
خوب تھے وہ دن کہ اِک انساں کا دم بھرتے تھے ہم

رُوح سے مربوط تھا اُس کی صدا کا زیر و بم
پے بہ پے جیتے تھے ہم اور دم بہ دم مرتے تھے ہم

خوب تھے وہ دن کہ تھا وجہِ خود آزاری خلوص
دوسروں کی تہمتیں بھی اپنے سر دھرتے تھے ہم

اَب بھی سوچیں تو خود کو بھی یقیں آتا نہیں
اُس سنہرے دور میں کیا کیا، کیا کرتے تھے ہم

◆

مژہ سے اشک ڈھلیں، دل میں حسرتیں جاگیں
اِدھر سے گزروں تو سوئی محبتیں جاگیں

شکستِ دل کی صدا پے بہ پے سنائی دے
مٹی مٹی سی خیالوں میں صورتیں جاگیں

کتابِ درد کی گم کردہ آیتیں اُتریں
جہانِ شوق کی بھولی روایتیں جاگیں

یہی ہے ترکِ محبت؟ کہ ایک عمر کے بعد
ملے وہ اب بھی تو دِل میں شکایتیں جاگیں

ہے تیری یاد وہ آئینۂ رُو برو جس کے
ہزار سال کی کھوئی رفاقتیں جاگیں

وہ سرکشیدہ چٹانیں، وہ چاندنی وہ سکوت
کہ دل کی چاپ سے سینے میں ہیبتیں جاگیں

کبھی ملو تو چلیں پھر اُنھی پہاڑوں میں
کہ پتھروں پہ پرانی عبارتیں جاگیں

○

سراغِ عمرِ رفتہ پا کے روئیں
پرانے راستوں پہ جا کے روئیں

سہارا دے اگر کوئی تو ہم بھی
ہجومِ درد سے گھبرا کے روئیں

کسی دن اہلِ دُنیا سے بہت دُور
خدا کے بازوؤں میں جا کے روئیں

ہر اِک آغاز پہ سو خواب دیکھیں
ہر اِک انجام پہ پچھتا کے روئیں

نوا ڈوبی ہوئی ہو سوزِ دل میں
عزیزوں کو لہو رُلوا کے روئیں

بہت دن سے یہ حسرت ہے کہ خورشیدؔ
کسی دن خود کو تنہا پا کے روئیں

○

سب سخن میں بھی نہ سمٹیں گے خزینے دل کے
دفن دل ہی میں رہیں گے یہ دفینے دل کے

غرفۂ جاں میں دوبارہ کوئی آیا نہ گیا
ایک آہٹ کو ترستے رہے زینے دل کے

یہ سیہ رات، یہ وحشت کدۂ تنہائی!
اور یہ آسیب کے مانند قرینے دل کے

ایک چاپ، ایک صدا، ایک حنائی دستک
اور پٹ کھول دیے اُٹھ کے کسی نے دل کے

غمِ دُنیا، غمِ دیں، عشق و ہوس، جذب و خرد
ہر سمندر میں ہیں دو چار سفینے دل کے

کیا قیامت ہے کہ وہ بھی تری تصویر نہیں
جس پہ اک عمر لگے خون پسینے دل کے

دستِ بیدادِ زمانہ سے بس اتنی ہے طلب
قتل کر لے مگر انداز نہ چھینے دل کے

لے کے آیا ہوں ترے پاس فقط گردو غبار
رنگ سب چھین لیے دربدری نے دل کے

میرا معیارِ سخن تیری پذیرائی ہے
تو نہ پہنے تو ہیں جھوٹے یہ نگینے دل کے

○

لوگ کیا بن جائیں، باطن کا کہا مانیں اگر
معجزے ہو جائیں، جی میں معجزے ٹھانیں اگر

ہم ہیں اِس گھر میں تو اِس کو پوچھتا کوئی نہیں
اِک جہاں ٹوٹے یہاں سونے کی ہوں کانیں اگر

حسبِ حال اِک خامشی تصویر خانے میں رہے
خوب ہو مٹّی کے پُتلوں میں نہ ہوں جانیں اگر

خاکساری پر ہیں کیا کیا اہلِ دُنیا کے سلوک
کیا قیامت ہو، ہم اپنی قدر پہچانیں اگر

اہلِ دل اہلِ جہاں کے غم میں ہیں کیوں دل فگار
میں اِنہیں درسِ خموشی دوں، مری مانیں اگر

ہیں یہی منصف تو میرے قتل ہو جانے کے بعد
کیا تعجب ہے مجھے قاتل بھی گردانیں اگر

ہے روا خورشیدؔ اُن کھوئے خزانوں کے لیے
ہم سرِ گورِ غریباں خاک بھی چھانیں اگر

○

ظاہر میں سرِ دہر سبک سر بھی رہے ہم
پر باطنِ ایّام کو ازبر بھی رہے ہم

تو لاکھ گریزاں تھی، پر اے عمرِ گریزاں
الزامِ مجسم تھے ترے سر بھی رہے ہم

پھولوں کی طرح شاخ سے پھوٹے بھی کئی بار
رنگوں کی طرح خاک میں مضمر بھی رہے ہم

خوشبو نہیں ٹھہری کوئی جلوت کی فضا میں
خلوت میں جو بیٹھے تو معطّر بھی رہے ہم

ڈھونڈا ہی کیے ہم کو، ہمیں دیکھنے والے
اندھوں کو شب و روز میسّر بھی رہے ہم

گوہر بھی کہا، چند شناساؤں نے ہم کو
اور جادۂ ایّام پہ پتھر بھی رہے ہم

خورشیدؔ! سرِ دار و رسن ہی سہی لیکن
اُس شوخ کے قامت کے برابر بھی رہے ہم

○

وہ دن جب ایک ایک روش پہ سو سو روشن آنکھیں تھیں
اس دن باغ کے اک گوشے میں کیا من موہن آنکھیں تھیں

قید و سلاسل ہوتے تو ہم کب کے توڑ کے جا چکتے
قید و سلاسل کچھ بھی نہیں تھے پیار میں بندھن آنکھیں تھیں

اب تک۔ آنکھوں میں پھرتا ہے دن وہ تیری جدائی کا
پت جھڑ پت جھڑ دل کا آنگن ساون ساون آنکھیں تھیں

یاد ہے ہم کو وہ دن جب ہم تیری گلی سے گزرے تھے
چلمن چلمن سرگوشی تھی، روزن روزن آنکھیں تھیں

لاکھ ادائیں پاؤں پڑیں ہم رُوپ نگر میں نہ ٹھہریں گے
کیا کیا جی میں ٹھانی تھی، پر ساتھ یہ بیرن آنکھیں تھیں

دست و گریباں تھیں ماتھے پر موجیں ظاہر و باطن کی
چہرے سکھ کا سوانگ رچائے دکھ کا درپن آنکھیں تھیں

کیا بتلائیں دیکھا ہم نے سپنے میں کل کیسا رُوپ
ایسا رُوپ کہ اِک دوجے کی بیرن سوکن آنکھیں تھیں

◆

جدا جو تم سے نظر ایک پل ہوئی ہوتی
شبِ وصال میں کیا کیا غزل ہوئی ہوتی

جو پاؤں ٹوٹ گئے آ کے منزلوں کے قریب
اُنہی کے ساتھ تمنا بھی شل ہوئی ہوتی

دلِ تباہ کو حسرت سے دیکھنے والے
یہی نگاہ اگر برمحل ہوئی ہوتی

پہیلی زندہ ہے ابہام کے وسیلے سے
کسی کو یاد نہ رہتی جو حل ہوئی ہوتی

نہ جانے آج تلک زندگی کا کیا ہوتا
وہ واردات اگر آج کل ہوئی ہوتی

شبِ فراق کی، کوتہ نصیبیاں خورشید
کسی کی زلفِ مسلسل کا بل ہوئی ہوتی

○

کچھ یقیں بھی آ چلا وہم و گماں کے ساتھ ساتھ
چل پڑی جوے رواں، ریگِ رواں کے ساتھ ساتھ

نام لیتے ہی ترا، سینے میں سیلاب آ گیا
تو تہ دل میں بھی ہے نوکِ زباں کے ساتھ ساتھ

ڈوبنے دیں گے نہ اب اِس دل نشیں مہتاب کو
ہم بھی گردش میں رہیں گے آسماں کے ساتھ ساتھ

بہ رہا ہے دل کسی کاغذ کی ناؤ کی طرح
ہوں سرِ ساحل رواں، آبِ رواں کے ساتھ ساتھ

بڑھتا جاتا ہے مری انجام بینی کے سبب
خوفِ تنہائی ہجومِ دوستاں کے ساتھ ساتھ

دل کی تنویریں کجا، لفظوں کی تصویریں کجا
کھل گیا عجزِ بیاں، طرزِ بیاں کے ساتھ ساتھ

جانے یہ اُلفت ہے یا بے اعتمادی ہے کہ لوگ
رات دن پھرتے ہیں اپنے راز داں کے ساتھ ساتھ

ہو سکے خورشیدؔ تو کچھ یوں بسر کر جائیے
دل خدا کے ساتھ ہو، پیکر جہاں کے ساتھ ساتھ

○

کون دیکھ پائے گا جوہرِ نہاں دل کا
رائگاں ہی جائے گا گنجِ شائگاں دل کا

رنگِ محفل ایسا ہے دل بھی کم دھڑکتا ہے
ورنہ یوں تو حق ٹھہرا نالہ و فغاں دل کا

چار سمت استادہ، تن کی چاردیواری
اور اُس کے بیچوں بیچ ڈولتا مکاں دل کا

اپنی رزمگہ میں دل آپ مردِ میداں ہے
اور کون اُٹھاتا ہے قرعۂ گراں دل کا

شش جہاتِ دُنیا دل کی کب سمائی تھی
اپنی اِک زمیں دل کی، اپنا آسماں دل کا

سوگوار لگتی ہے چشمِ سرمگیں اُس کی
جیسے اُس کی چوکھٹ میں آ لگا دھواں دل کا

وقت اُڑتا جاتا ہے، زرد پڑتا جاتا ہے
شاخسارِ ماضی پر سبز آشیاں دِل کا

جو فقط دلائل کے تار و پود سے اُبھرے
اُس یقیں سے بہتر ہے دوستو، گماں دل کا

ہیں خیال و خواب و خوں، سب طواف میں اِس کے
مثلِ سنگِ کعبہ ہے، سنگِ آستاں دِل کا

دل سے حرفِ حق اکثر پھوٹتا تو ہے لیکن
زور توڑ دیتی ہے لغزشِ زباں دِل کا

اب کہاں ہے سینوں میں وہ دفینۂ پر سوز
اب تو ایک تہمت ہے نامِ بے نشاں دِل کا

○

(بیادِ مجید امجد)

پلٹ کے صبح کا سورج تو روز آئے گا
مسافرِ ”شبِ رفتہ“ کبھی نہ پلٹے گا

اُسی کی دیکھتے ہیں راہ سب جو کہتا تھا
”میں جب اِدھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا“

وہ اِک درخت کہ تھا دوسروں پہ سایہ فگن
اب اُس کی طرح تمازت کو کون جھیلے گا

نظر پہ کس کی وہ اسرار منکشف ہوں گے
زباں سے کس کی لہو شعر بن کے ٹپکے گا

وہ لہجہ جس میں رچی تھیں مسافتیں لاکھوں
اب اُس تھکے لہجے میں کون بولے گا

وہ ایک نافہ کہ ہے آدمی کے باطن میں
اب انجمن میں گرہ اُس کی کون کھولے گا

غروبِ تابشِ امجدؔ کے بعد اب خورشیدؔ
کہاں وہ ذہن کہ جو اَن کہی کو سمجھے گا

○

(بیادِ مجید امجد)

ہوئے چمن میں مرے ترجماں گلاب کے پھول
لہو میں غرق، تبسّم کناں گلاب کے پھول

میں اِن کے ساتھ خزاں میں بکھرتا جاتا ہوں
اُڑا رہے ہیں مری دھجیاں گلاب کے پھول

جس انجمن میں کہ تھا کاغذی گلوں کا چلن
اُس انجمن میں جلے رائگاں گلاب کے پھول

ہمیں تو حسنِ نظر کا جنون ہے، ورنہ
کہاں یہ ریگِ رواں اور کہاں گلاب کے پھول

میں جانتا ہوں انہیں زخمِ تازہ کا فرمان
وہ بھیجتے ہیں مجھے ارمغاں گلاب کے پھول

کوئی سنے تو خموشی ہے گفتگو ان کی
کہ صد زباں بھی ہیں یہ بے زباں گلاب کے پھول

دعائیں کاوشِ امجدؔ کو دیجیے خورشیدؔ
ہیں جس کے فیض سے نکہت فشاں گلاب کے پھول

ترے سخن میں رہے تا ابد گلوں کی مہک
”تری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول“

○

احساس کی تہوں میں جو موجِ قلق چلے
قرطاس پر زبانِ قلم ہو کے شق چلے

ہے دہر کی نہاد ہی سرگشتۂ رسوم
حق کو بھی ایک رسم بنائیں تو حق چلے

کب تک بچا بچا کے رکھوں اک نگہ کی یاد
مانگے کی زندگی کی کہاں تک رمق چلے

اُس کے نقوشِ پائے حنا بستہ دیکھ کر
مٹی پہ آسماں سے اُتر کر شفق چلے

ہم جس کو پڑھ رہے ہیں دبستانِ عشق میں
فرہاد و قیس سے نہ وہ تازہ سبق چلے

مشکل ہے ضبطِ سیلِ سخن بسکہ دوستو
سی لوں اگر لبوں کو تو چھاتی تڑق چلے

جو لب پہ نیم شب تہِ دل سے نکل کے آئے
وہ بات سینہ سینہ ورق در ورق چلے

ہستی ندامتوں کے دو آبے میں ڈوب جائے
آنکھوں سے اشک اور جبیں سے عرق چلے

خورشید کہہ گزر یہ سخن گسترانہ بات
دیکھیں کسی سے گر یہ زمینِ ادق چلے

○

ملتا ہی نہیں درد کا پیکر کوئی مجھ سا
آئینے میں اک شخص ہے کمتر کوئی مجھ سا

ایمان بھی تنہا ہے مرا کفر بھی تنہا
مومن کوئی مجھ سا ہے نہ کافر کوئی مجھ سا

ہے کون جو اس ابر کے پردے میں رواں ہے
دیوانہ ہے دیوانہ سراسر کوئی مجھ سا

کہسار کے دامن میں ملاتا ہے نہاں کون
آواز سے آواز برابر کوئی مجھ سا

لینے نہیں دیتا کسی کروٹ مجھے آرام
اک شخص، ہٹیلا، مرے اندر کوئی مجھ سا

میں ٹوٹتا تارا ہوں نظر مجھ سے ملا لو
پھر کاہے کو دیکھو گے مکرّر کوئی مجھ سا

آئینہ ہوں اور چہرۂ خورشید پہ وا ہوں
ہو گا کہیں قسمت کا سکندر کوئی مجھ سا

○

ہر چند انجمن میں ہوں، تنہائیوں میں ہوں
دو زور سے صدا کہ میں گہرائیوں میں ہوں

اب تک اسی طلسم مکرر میں قید ہوں
اب تک تری بنائی ہوئی کھائیوں میں ہوں

کوئی تو ہو کہ جو مرا شیرازہ بند ہو
بکھرا ہوا خیال کی پہنائیوں میں ہوں

مدّت کے بعد آئنے سے گرد جھاڑ کر
کچھ دن سے اب خود اپنی پذیرائیوں میں ہوں

جب انجمن میں تھا تو میں تنہا تھا اور اب
تنہا ہوں اور انجمن آرائیوں میں ہوں

○

کچھ قطار اندر قطار ایسی ہوئی توفیرِ گُل
پڑ گئی موجِ صبا کے پاؤں میں زنجیرِ گُل

رات پھولوں میں ترازوے حسیں تھا جلوہ ریز
شعلہ زن تھی سبزیِ اوراق میں تصویرِ گُل

موجۂ بادِ صبا کی لوح، شبنم کے حروف
کس نزاکت سے مشیت نے لکھی تقدیرِ گُل

بڑھ رہا ہے دم بہ دم ذوقِ جگر کاوی مرا
ہو رہی ہے شاخ کے اندر کہیں تعمیرِ گُل

اہلِ گُلشن کے شبستاں میں نہیں شعلے کو دخل
یا چراغِ کرمکِ شب تاب یا تنویرِ گُل

* * *

ترک کریں لب کھولنا
چھوڑ دیں ہنسنا بولنا

دُنیا ساری بِس بھری
کیا اِس میں رس گھولنا

آنسو تو انمول ہے
آنسو کا کیا تولنا

تو ہے پری خیال کی
دِل ہے اُڑن کھٹولنا

اپنا بھی کیا کام ہے
لہجے میں خوں گھولنا

پھونک کے اپنے آپ کو
راکھ سے موتی رولنا

○

کھو گئی دُور کہیں بانگِ درا، ڈھونڈ کے لائیں
دشتِ ماضی میں چلیں، اپنا پتا ڈھونڈ کے لائیں

اب بھی صحرا میں ہو شاید وہ امانت باقی
وہی گم گشتہ نشانِ کفِ پا ڈھونڈ کے لائیں

میں اُسے رُوٹھ کے جانے تو دُوں لیکن کیسے
جب ذرا اُٹھ کے چلا، دل نے کہا ڈھونڈ کے لائیں

ہاتھ ملتے ہوئے مٹی میں اَٹے لوٹ آئے
خاک ہی خاک ہے اس خاک سے کیا ڈھونڈ کے لائیں

تو اگر شکر کا رب ہے تو پھر اے ربِ کریم
کیا شکایت کو کوئی اور خدا ڈھونڈ کے لائیں

تپشِ دہر میں سایہ نہیں ملتا کوئی
پھر وہی دوشِ محمدؐ کی ردا ڈھونڈ کے لائیں

نظمیں

نیلے پہاڑ

پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ
دُور اُفق پر آسمانوں سے ملے
سبز پیڑوں کی قطاروں سے پرے
پا پیادہ گاؤں کی جانب رواں
سادہ دِل انجان بُڑھیا کی طرح
بادلوں کی گٹھریاں سر پر رکھے
پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ

جانے کب قدموں کی زنجیریں کٹیں
جانے کب رستے کی دیواریں ہٹیں

قفل ٹوٹیں حاضر و موجود کے
جانے کب بادل کے رتھ پر بیٹھ کر
بجلیوں کے تازیانے مارتا
بارشوں کے پانیوں میں بھیگتا
میں اڑاؤں آندھیوں کے راہوار
پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پہاڑ

ایک خواب

ساتھ اگر تم ہوں تو پھر ہم
ہنستے ہنستے، چلتے چلتے،
دُور آکاش کی حد تک جائیں
کالی کالی سی دلدل سے
تپتا تانبا پھوٹ رہا ہو

مکڑی کے جالے کا فیتہ
کاٹ کے ہم اُس باغ میں جائیں
جس میں کوئی کبھی نہ گیا ہو

کوکنار کے پھول کھلے ہوں
بھونرے اُن کو چوم رہے ہوں
پتھر سے پانی چلتا ہو

میں پانی کا چُلّو بھر کر
جب ماروں چہرے پہ تمہارے
پہلے تم کو سانس نہ آئے
اور پھر میرے ساتھ لپٹ کر
ایسے چھوٹے دھار ہنسی کی
جیسے چشمہ پھوٹ رہا ہو

پہچان

کہیں تم ملو تو
مسائل کو اُلجھا ہوا چھوڑ کر ہم
علائق کی زنجیر کو توڑ کر ہم
چلیں اور کنج چمن میں کہیں
سایۂ تاک میں بیٹھ کر
بھولے بسرے زمانوں کی باتیں کریں
اور اِک دوسرے کے خدوخال میں
اپنے کھوئے ہوئے نقش پہچان کر
محو حیرت رہیں
اور نرگس کی صورت
وہیں جڑ پکڑ لیں

درختو!

درختو! تم سے ملنے کی گھڑی جانے کب آئے گی
پلٹ کر پھر وہ فصلِ دوتی جانے کب آئے گی

درختو! میں جہاں کے جال میں اُلجھا ہوا طائر
اُلجھتا جا رہا ہوں اور ، جتنا پھڑ پھڑاتا ہوں ،
وہ اِک بوڑھا شکاری جس کے ہاتھوں میں درانتی ہے
وہ جس کی مُٹھیوں میں بند قسمت کے نوشتے ہیں
اُسی کی چاپ سے اُمید بھی ہے وسوسے بھی ہیں
درختو! جانے میرے حق میں اُس کا فیصلہ کیا ہو

درختو! روزنوں سے جال کے، اکثر نظر میری
تمہارے سبز لرزاں ہاتھ کی جنبش پہ پڑتی ہے
خدا جانے یہ شوقِ وصل ہے یا رمزِ رخصت ہے
وداعِ واپسیں ہے یا گلے لگنے کی حسرت ہے
پلٹ کر آ سکوں گا پھر کبھی میں آشیانے میں
کہ مر جاؤں گا بوڑھی مٹھیوں کے قید خانے میں
درختو! تم سے ملنے کی گھڑی جانے کب آئے گی

جست

مرا حال یہ تھا
زمستاں میں جب برف زاروں میں چلتے ہوئے
گرسنہ بھیڑیوں کی قطاریں گزرتیں
تو میں کپکپاتا
یہ جی چاہتا، عرصۂ زیست کو چھوڑ کر
کوہساروں کے اُس پار ڈیرہ لگا لوں
اِدھر، میرے جاتے ہی برفیں پگھل جائیں
گرگانِ بے مہر میرے نقوشِ قدم سونگھ کر مجھ تک آنے نہ پائیں

مگر اب تو جیسے
مری روح میں کوئی چیتا سا انگڑائیاں لے رہا ہے
یہ جی چاہتا ہے
کہ گرگ آشتی کی سبھا جب لگے
میں بھی تصویر جیسی کھلی آنکھ لے کر

———— جو ہرگز جھپکتی نہ ہو ————
غار کے وسط میں آن بیٹھوں
اور ان میں سے جس جس کی آنکھیں جھپکتی چلی جائیں
وہ لحظہ لحظہ مرا رزق ہو
میں اُسے پارہ پارہ کروں

طلوع[۱]

میں بطنِ ماہی کے گھپ اندھیرے میں
بے بصر تھا
کبھی گریباں میں جھانکتا تھا
تو اپنے اندر بھی بحرِ ظلمات کے تلاطم کی چاپ سنتا

اچانک اک روز جب لرزتی ہوئی سپیدی کا تار
حدِ نظر پہ ابھرا
تو لب پہ دیوانہ وار چیخیں کچھ ایسے آئیں
کہ جیسے اک عمر سے بھٹکتے ہوئے سفینے کے
ریش و ناخن دراز ملاح
دور کے پانیوں میں لنگی

زمیں کی بھوری زبان دیکھیں
تو گنگ ہونٹوں میں جان پڑ جائے

غرض کہ اب شپرّوں سے بُوموں سے، میرا وقتِ فراق آیا
کہ میرے باطن کے گھپ اندھیرے میں لحظہ لحظہ
عقاب کی آنکھ کھل رہی ہے
اور اُس کے روزن سے
صبح کی سیمگوں فضاؤں میں
میں، تند رووں کو محوِ پرواز دیکھتا ہوں

آخری فیصلے کا عذاب

پہاڑ پر میں کھڑا ہوا ہوں
چہار جانب یہ تیرگی جو اُمڈ رہی ہے
مرا تذبذب بڑھا رہی ہے

پہاڑ کے اک طرف ہیں تا دُور پیچ و خم ہاتھ کی لکیریں
کہ جن پہ زرد اور سیاہ رنگت کی چیونٹیاں کلبلا رہی ہیں
سیاہ اژدر فلک کی جانب اٹھائے نتھنے
سیاہ انفاس کے دھوئیں سے فضا میں کالک ملا رہے ہیں
دھوئیں کے ان بادلوں کے نیچے
لرزتے رنگوں کی جھلملاہٹ
کہ جیسے خوش رنگ کانچ کے جگنوؤں کا چھینٹا

پہاڑ کے دوسری طرف
سبز پوش ڈھلوان —— دیودار اور چیڑ کی محفلیں
جڑی بوٹیوں کے مسکن
پہاڑ کے اِس طرف بھی جگنو
اصیل جگنو:
یہ بوٹیاں جو اُمڈتی تاریکیوں کے پردے میں
سانپ کے مَن کی طرح سے جگمگا رہی ہیں
اِنہیں کسی نے چھوا نہیں ہے
اگر مرے پاؤں اِن میں جائیں
تو پہلی پگڈنڈیاں بنائیں

مگر یہاں کی اچھوتی سرسبزیوں میں
کیسی خموش، کتنی عمیق ہیبت ہے
جس سے دل، آپ اپنی دھڑکن سے ڈر کے سینے میں سہم جائے

غروب ہونا ہے مجھ کو
میں اِس پہاڑ کی کس جہت میں ڈوبوں —— ؟

سبز سے سفید میں آنے کا غم

نظر اُٹھاؤں
تو سنگِ مرمر کی کورِ بے حس
سفید آنکھیں
نظر جھکاؤں تو شیرِ قالین گھورتا ہے
مرے لیے اس محل میں آسودگی نہیں ہے
کوئی مجھے اِن سفید پتھر کے گنبدوں سے رہا کرائے
میں اک صدا ہوں
مگر یہاں گنگ ہو گیا ہوں
مرے لیے تو
اُنہیں درختوں کے سبز گنبد میں شانتی تھی
جہاں مری بات گونجتی تھی

چُھٹی کے دِن دفتر میں پھول

چھ دن کاغذ کا پیراہن پہنے گزرے
بہری اندھی فریادوں کی بھیڑ میں گھٹتے گھٹتے گزرے

آج تو اپنے آپ میں آئیں
پھول ہنسیں مہکیں مسکائیں
ہرے بھرے پیڑوں میں سن کر مست ہوا کی تھاپ
دور دور تک کہیں نہیں ہے کاغذ کے چلنے کی چاپ

سات دنوں میں ایک یہ دن ہے اپنے آپ میں آنے کا
ہنسنے کا مسکانے کا

بھونروں سے نین ملانے کا
کل پھر کاغذ ہو جائیں گے
بہری اور اندھی فریادوں کی اِک بھیڑ میں کھو جائیں گے
آج تو اپنے آپ میں آئیں

دُھند اچھی ہے

دُھند اچھی ہے
مرے ذہن کی ہم زاد ہے دُھند
دُھند اچھی ہے
ہر اک جبر سے آزاد ہے دُھند

دُھند میں ڈوبے ہوئے خار و گُل و سنگ و زُجاج اچھے ہیں
ایک ابہام میں تحلیل ہوئے جاتے ہیں منظر سارے
پردۂ ذہن پہ کجلائے ہوئے شہر کی تصویر ہے دُھند
خواب میں دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر ہے دُھند

ہاں مگر دُھند کے اُس پار چمکتا سورج
تند خو شعلہ نفس، ہونکتے مرکب پہ سوار
اپنی ہیرے کی کنی ایسی انی لے کے بڑھا آتا ہے

شگوفے

میں سوچتا ہوں خدا جانے کتنے دل تھے جنہیں
لہو میں گھل کے بھی آنکھوں کا راستہ نہ ملا
نہ جانے کتنے جگر غم کے تیر کھا کھا کر
وفورِ درد سے پتھر ہوئے پگھل نہ سکے

نہ جانے کتنے حسیں کارواں شگوفوں کے
ہزار قافلۂ رنگ و بو جلو میں لیے
سمندِ ذوقِ نمو پر سوار شعلہ بجاں
اسی طلب میں کہ ہستی کا پیرہن مل جائے
ضمیرِ شاخ میں جل بجھ گئے نکل نہ سکے

اِنہیں شگوفوں کے زُمرے میں وہ خیال بھی ہیں
جو میرے سینے کی ہر موجِ خوں میں غلطاں ہیں
مگر جو میری تنگ ظرفیٔ زباں کے سبب
ہنوز پیکرِ حرف و صدا میں ڈھل نہ سکے

چند لمحے

چند لمحے جنہیں اِک لغزشِ پا نے میری
کبھی ماضی کے اندھیروں میں کچل ڈالا تھا
چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح لہرا کر
میرے احساس کے ہر گوشے پہ چھا جاتے ہیں
میری آنکھوں سے مرے خواب اُڑا جاتے ہیں
رات بھر کے لیے دیوانہ بنا جاتے ہیں

خون ہو جاتا ہے جب سوزشِ پنہاں سے بھڑکتا ہوا دل
تیرنے لگتا ہے رگ رگ میں لہو ہو کے دھڑکتا ہوا دل
کپکپاتے ہوئے ہونٹ
تھرتھراتی ہوئی نبض
ٹمٹماتے ہوئے آنکھوں کے دیے
گود میں سیلِ فراواں کو لیے
ایسی حالت میں کوئی کیسے جیے، کیسے جیے؟

پا بہ گِل سر بفلک

آج کا دن بھی اُسی اپنی روش پر گزرا
آج کی شب بھی اُسی اپنے قرینے پہ ڈھلی
آج بھی کم نہ ہوئی سوزِ دروں کی تگ وتاز
دیکھ کر چاند ستارے — مرا ذوقِ پرواز
میرے ٹوٹے ہوئے شہپر سے اُلجھتا ہی رہا
پا بہ گِل سر بفلک ہے مری ہستی کا شجر
میں بلندی میں سمانے کو ہمکتا ہی رہا

ہے اُدھر عرشِ بریں میرے تجسّس کا ہدف
اور اِدھر فرشِ زمیں میرا عناں گیر بھی ہے
نہ اُمنگوں سے رہائی نہ شکستوں سے فرار
یعنی اس پاؤں میں چکر بھی ہے زنجیر بھی ہے

دُعائے نیم سنگ

میں اُس جہانِ طلسم میں ہوں
جہاں ہزاروں ہی شاہزادوں نے
مڑ کے دیکھا ہے
اور پتھر کے ہو گئے ہیں

کمر کمر میں بھی سنگ بستہ
مقامِ اعراف میں کھڑا ہوں
چلوں تو مُردوں کی بے حسی ہے
تھموں تو زندوں کی بے کلی ہے
مگر مرا دل دھڑک رہا ہے
مگر مری آنکھ میں نمی ہے

مگر مرے ارد گرد پتھر کے شاہزادے ہیں
جن کے سنگیں لبوں پہ عیّار سامری نے
وہ ایک پتھر کی مسکراہٹ تراش دی ہے
جو دائمی ہے
یہ ہنس رہے ہیں
بہشتِ غفلت میں بس رہے ہیں
یہ بے تاثّر جبین ان کی
مثالِ سنگِ مزار پتھر کی ہو چکی ہے
دلوں سے آنکھوں تک آنے والی
وہ اِک رگِ اشک بار پتھر کی ہو چکی ہے

اب اس سے پہلے کہ میرے ہاتھوں میں بھی رگِ سنگ دوڑ جائے
میں ہاتھ اُٹھاؤں
"خدائے قدّوس! بھیج اُس مردِ منتظر کو
جو ہم پہ آبِ حیات چھڑکے"

دل کو جانے....

دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے
دُنیا سے الگ ہو جانے کی
اپنے اندر کھو جانے کی
دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے

رستوں پہ کبھی پھرتے چلتے
لوگوں سے کبھی ملتے جلتے
چپکے سے کان میں کہتا ہے
جو کچھ ہے خواب ہے دھوکا ہے
چل دُور کہیں تنہائی میں
میں اور تو مل کر سوچیں گے
تدبیر کوئی، ان خوابوں میں
تعبیر کوئی بو جانے کی
دل کو جانے یہ دُھن کیا ہے

چل اے دل آسماں پر چل

چل اے دل آسماں پر چل
وہاں سے چل کے اس پُر شور بزمِ ہست کو دیکھیں
بلند و پست کو دیکھیں
زمیں کی سرنگونی آسماں سے کیسی لگتی ہے
پہاڑوں کی سرافرازی وہاں سے کیسی لگتی ہے
کفِ دست جہاں کی پیچ و خم ریکھائیں کیسی ہیں
جو تیری راہ کا پتھر ہیں وہ کٹھنائیں کیسی ہیں
چل اے دل آسماں پر چل

دل تو اب یہ چاہتا ہے

دل تو اب یہ چاہتا ہے
رشتے سب سے توڑ کے
دنیا سے منہ موڑ کے
جا نکلے اُس اور
جہاں چلے نہ کوئی زور

کوئی نفی ہو اور نہ کوئی اثبات
دُور دُور تک دیے جلائیں
کھلتے پھول —— اور راس رچائیں
جھومتے جھونکے دفیں بجاتے پات
اور مرے ٹھنڈے شانے پر
خوشبو ایسا اِک نادیدہ ہات
پاگل دل تو اب یہ چاہتا ہے

ڈوبتے سورج کا خود کلامیہ

چلو خورشید اُتر جائیں پسِ کہسارِ گم نامی
ڈبو دیں جھیل کے پانی میں اپنی زرد پیشانی
ملیں مٹی بدن پر جھیل کے پاتال سے لے کر
کہ جس کی سوندھ سے بیتے دنوں کا واہمہ پلٹے
درختوں کی جڑوں میں رکھ کے سر سبزے میں کھو جائیں
سُنیں چڑیوں کا پیہم شور کرنا شاخساروں میں
چراگاہوں میں ننھی تتلیوں کی خوش دلی دیکھیں
پسِ مژگاں مچلتے آنسوؤں کی بے کلی دیکھیں
جو بے اذنِ روانی آنکھ سے دامن تک آ جائیں
اور اُن کے آنگنوں میں حافظہ کھویا ہوا پلٹے
ہوا کی زد پہ لائیں جسم اپنا پیرہن اپنا
بسی ہے جس میں بوئے ناگوار اوجِ وجاہت کی
چلو خورشید اتر جائیں پسِ کہسارِ گم نامی
کہ ہم کو خوش نہیں آتی فضا افلاک شہرت کی

قربِ قیامت

یہ چڑیا جو پنکھے سے ٹکرا گئی ہے
اسے تو فقط آشیانہ بنانے کی دھن تھی
اسے وقت کی پیٹھ سے لاکھ دو لاکھ سالوں کے گرنے کا اندازہ کب تھا
اسے کیا خبر تھی
وہ سرسبز ایّام مرجھا چکے ہیں
وہ انساں سے پہلے کے شاداب جنگل
جہاں گھونسلوں اور اڑانوں کے مابین
دھاتوں کی پرّاں فصیلیں نہیں تھیں

عقابوں کے پر آج بھی سرسرائیں
تو معصوم چڑیوں کے دل سہم جائیں
مگر ان کو معلوم کیا ہے
کہ قُربِ قیامت کے آثار پیدا ہیں
بے جان لوہے کو پر لگ گئے ہیں

فیصلہ

اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں
اجنبی پھر نہ کوئی درپئے آزار آ جائے
ایک دستک میں مری ساری فصیلیں ڈھا جائے
اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں

ایک اہرام نہ چن لوں صفتِ دودِ حریر
کوئی آئے تو بس اک گنبدِ دربستہ ملے
رازِ سربستہ ملے
لاکھ سر پھوڑے صدا کوئی نہ مجھ تک پہنچے
قاصدِ موجِ ہوا کوئی نہ مجھ تک پہنچے
اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں

سارے اندیشے مگر ایک طرف
ایک طرف تیری اُمید
جانے کس وقت اِدھر تیری سواری آ جائے
اجنبی لاکھ کوئی میری فصیلیں ڈھا جائے
مجھ کو دیوار میں دروازہ لگانا ہوگا

محاسبہ

ہوا کہیں نام کو نہیں تھی
اذانِ مغرب سے دن کی پسپا سپاہ کا دل دھڑک رہا تھا
تمام رنگوں کے امتیازات مٹ چکے تھے
ہر ایک شے کی سیہ قبا تھی

جگہ جگہ بام و در کے پیکر
اُفق کے رنگین چوکھٹے میں
مثالِ تصویر جم گئے تھے
شجر حجر سب کے سب گریباں میں سر جھکائے
محاسبہ کر رہے تھے دن بھر کے نیک و بد کا
طویل قامت حزیں کھجوریں
کٹی ہوئی ساعتوں کے ماتم میں
بال کھولے ہوئے کھڑی تھیں

نشیمنوں کو پلٹتے طائر
کچھ ایسے تھم تھم کے اڑ رہے تھے
کہ صفحۂ آسماں پہ گویا
سرابِ پرواز بن گئے تھے

اِدھر مرا دل
دھڑک دھڑک کر
عجیب عبرت بھری ندامت سے سوچتا تھا
کہ آج کا دن بھی کٹ گیا ہے

ہم زاد

میں آج دفتر میں صبح پہنچا
تو اِک نیا زرد زرد چہرہ نظر پڑا
جس کو دیکھتے ہی
معاً مرے دل میں اِک دریچہ کھلا
اور اُس کے عقب سے
اُس زرد شکل کی ہم شبیہ
اِک سُرخ شکل اُبھری ——
شریر، گستاخ، بے تکلف ——
اُبھر کے میرے قریب آئی

قریب آ کر
نظر ملا کر
وہ کھلکھلا کر ہنسی

اور اپنے شریر پوروں سے
میرے کالر کی سختیاں پامال کر دیں
سفید بالوں کے پیچ و خم میں
سیاہیوں کی لکیر کھینچی
نگاہ سے سب خشونتیں
اور جبیں سے سب سلوٹیں مٹا دیں
مجھے دریچے سے لے کے نکلی

طویل راہوں پہ
سبزہ زاروں میں
لہلہاتے حسین کھیتوں میں
چاند تاروں میں پھر رہی تھی
کہ جب اچانک
دریچۂ دل کے بند ہونے سے وقت کے پل صراط کی تیز ڈور ٹوٹی

وہی سفیدی کے پیچ و خم تھے
وہی سفیدی کے پیچ و خم کے تلے جبیں پر شکن

نگہ میں خشونتیں
رُوبرو وہی زرد زرد چہرہ
جو کانپتی انگلیوں سے فائل کو میز پر رکھ کے ہٹ رہا تھا

اورینٹل کالج کے لیے ایک نظم

اُٹھتی ہے حنائی بام و در سے
کھوئے ہوئے حافظے کی خوشبو
پھر جاگ اُٹھے ہیں دشتِ دل میں
سوئی ہوئی ساعتوں کے آہو

ہر سنگ یہاں کا آئنہ ہے
ماضی کا جو عکس لے رہا ہے
مانوس قدم عقب سے آ کر
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ رہے ہیں
کہتے ہیں کہ بوجھیے تو جانیں

جو آ کے کلاس رُوم کے پاس
بازو پھیلا کے رُک گیا تھا

بچوں پر اپنے جھک گیا تھا
برگد کا وہ پیڑ کٹ چکا ہے
لاشہ بھی یہاں سے ہٹ چکا ہے

اب بھی ہیں یہاں ہزار چہرے
باندھے ہوئے آرزو کے سہرے
راتیں ہیں یہاں وہی، وہی دن
سب کچھ ہے وہی، ہزار، لیکن
جو ہم سے کبھی یہاں رہی ہیں
وہ سادگیاں کہاں رہی ہیں ؟

وہ وضع، وہ خود سے بے نیازی
کچھ من کی خبر نہ تن کا کچھ ہوش
اک بے خبری کی رو زمانہ !
فردا تھا کوئی نہ تھا کوئی دوش

دُکھتا ہوا دل اُداس ایّام
جلتا ہوا دن بجھی بجھی شام

آنکھوں میں غموں کی تیرتی لہر
لیکن ہونٹوں پہ ضبط کی مہر

اک نقشِ قدم کی پیروی میں
دن رات اُداس اُداس چلنا
کہنا نہ کسی سے درد ہرگز
جلنا ، جلنا ، خموش ، جلنا

پہچان کے ایک لمسِ مانوس
ہاتھوں میں کتاب تھام لینا
اور دستِ خیال میں کسی کی
یادوں کے گلاب تھام لینا

سوچا نہ کبھی کہ چُپ رہے سے
یہ زخم تو راز ہی رہے گا
غنچہ جو کھلے تو بو بھی پھیلے
پائے گا وہی جو کچھ کہے گا

دل اپنی مہک میں آپ گم تھا
ہم سود و زیاں ذرا نہ سمجھے
کہتے بھی تو کیا کسی سے کہتے
جب اپنا ہی مدعا نہ سمجھے

اب بھی ہے طلسمِ عشق جاری
مجنوں ہے قتیلِ چشمِ آہو
کم کم ہی کہیں ملے گا لیکن
اُن گُنگ محبتوں کا جادو

اکیس اپریل

موت نے پہلے جُھک کر
قدم اُس کے چومے
اور اس سرد بوسے سے یخ بستہ ہوتی ہوئی جوئے خوں میں
بہی ——
اور اُس قلبِ بیدار کے سات چکر لیے
اور اُس ذہنِ برّاق کی نور ہی نور دہلیز پر آ کے ٹھٹکی

"اجازت اگر ہو
تو اس جگمگاتی مقدّس امانت کو
ان تیرہ ہاتھوں سے چھو لوں"

کہا: مرحبا!
اے فرستادۂ خالقِ نیست و ہست و غیب و حضور
یہی حکم ہے تو خد و خالِ خورشید پر
پردۂ شب گرا دے

مگر ہوشیار!
آخری سانس کے ساتھ
جب تو مرے جسمِ خاکی سے نکلے
تو میرے لبوں پر لکھی مسکراہٹ کو
پامال کر کے نہ جانا"

عبدالنبی کوکب

ایک ہی پل میں اُڑ گئیں کیسے کیسے علوم کی کرچیں
ریزہ ریزہ جن کا تو نے کاسۂ سر میں دان لیا تھا
مٹتی ہوئی تحریروں سے اور پارہ پارہ جھڑتی ہوئی کتابوں سے

مجھ کو یاد ہے تو نے بھری جوانی تج کر
اپنی ذات کی ساری رام کہانی تج کر
عیش و آرام دُنیائے فانی تج کر
اِک گوشے میں گھُٹ کر مِٹ کر
عطر کشید کیا تھا سینکڑوں سال کے سوکھے گلابوں سے
ایک ہی پل میں اُڑ گئیں..........

آج وہ کاسہ بھرا بھرا سا کاسہ تیرے سر کا
جس میں صرف ہوئی تھیں کتنے برسوں کی تعمیریں

کتنی مٹی مٹی تحریریں
ایک ہی لغزش سے کیوں چوک میں گر کر ٹوٹ گیا
کیسے چھوٹ گیا؟
تُو تو اسے سنبھال کے چلنے میں برسوں کا ماہر تھا
کیا یہ تیری لغزش تھی؟

میرے سوال پہ چپ چپ ہنستا ہے وہ تیرا
ہنستا ستارے جیسا چہرہ
جو مُرجھانے سے پہلے ہی ڈوب گیا
سو کبھی نہیں مرجھائے گا
میرے سوال پہ چپ چپ ہنستا جائے گا
''کیا یہ تیری لغزش تھی؟''

میرے جواب میں کہنے والا کہہ گیا
اور میں اُس کے کہے پہ سوچتا رہ گیا
''قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے
قاتل پہیے بے پہرا ہیں''[1]

---

[1] مجید امجد کی نظم ''ایکسیڈنٹ'' سے اقتباس۔

سلیم بے تاب

کہیں وہ ملتا تو پوچھتا میں
کہ جب تصادم ہوا
تو تیری نظر سے کس کس کے خواب
دل کی تہوں میں کیا کیا خیال گزرے؟

کہیں وہ ملتا تو پوچھتا میں
کہ جب تصادم نہیں ہوا تھا
تو تیری سوچوں کا رنگ کیا تھا؟

تجھے خبر تھی کہ دو قدم پر سفر کا انجام ہو رہا ہے؟
تجھے خبر تھی کہ آسمانوں کی رہگزر راہ میں پڑے گی؟
تری چھٹی حس کو آہٹ سنائی دی تھی؟

کہ تو فقط اپنے دل کی کھڑکی کے
صاف شیشے پہ آنکھ رکھے
بہارِ تخییل دیکھتا تھا
سخن کی شاخوں سے اَدھ کھلے پھول چن رہا تھا؟

مگر وہ شخص اب کہاں ملے گا
وہ اپنی درویش مسکراہٹ کا نقش
دنیا میں چھوڑ کر
خود اُفق کے اُس پار جا چکا ہے

ملا تو اُس دن ملے گا
جس دن کے ہول سے سر سفید ہوں گے
دلوں کی الواح پر ہر اک نقشِ آشنائی سراب ہو گا
نہ مجھ کو تابِ سوال ہو گی نہ اُس کو اِذنِ جواب ہو گا

ایک اچانک موت کا نوحہ

بظاہر یہ لگتا ہے
اُس ملگجی صبح کو سب سہاروں نے جیسے
اچانک ترا ساتھ چھوڑا
سحر نے زمیں پر قدم جب رکھا
تو اچانک زمیں بے وفا ہو گئی
اُبھرتا ہوا آفتاب
ایک ہی ناگہاں لغزشِ پا سے یوں لڑکھڑایا
کہ مغرب کے پاتال میں منہ کے بل جا سمایا
اچانک فرشتے کفن سائباں کی طرح تان کر
آسمانوں سے اُترے
گُلوں کی مہک کی جگہ دفعتہً بوئے کافور کی سرد مہری نے لے لی
شجر کے بدن سے نئی کونپلوں کی بجائے خزاں پھوٹ نکلی
بظاہر یہ لگتا ہے......

لیکن بھلا حادثہ ایک دم کب ہوا ہے
بہت دن سے اس سربمہر آتشیں راز کا گنگ فیتہ
خموشی سے جلتا چلا جا رہا تھا
فنا کے گرجتے ہوئے آبشاروں کے اُوپر تنا
رسیوں کا یہ پُل
ایک مدت گلتا چلا جا رہا تھا

ایک پیدل چلنے والے دوست کا نوحہ

ہجوم سے بچ کے
سُونے سُونے، خموش رستوں پہ چلنے والا
وہ اِس زمانے میں پاپیادہ مسافرت کا امین
رستہ بدل چکا ہے

نظر عبث اُس کا نقش
مانوس راستوں پر
تلاش کر کر کے چونکتی ہے
مجھے خبر ہے وہ جا چکا ہے
یہ جا بجا راہ میں اُبھرتی شبیہ اُس کی
نگاہ کی تشنگی نے مثلِ سراب ایجاد کر رکھی ہے

جب آخری بار اُس کو دیکھا
تو اس کا رستہ بدل چکا تھا
ہر اک طریقہ بدل چکا تھا
ہجوم سے بچ کے چلنے والا
ہجوم کے ساتھ چل رہا تھا

جب آخری بار اُس کو دیکھا
تو عمر بھر کی مسافرت کے خلاف
اُس کو سوار دیکھا
اور اُس کے پہلو میں پا پیادہ ہجوم کو سوگوار دیکھا

نوحہ

تو دیکھنے میں مائلِ شوقِ سفر نہ تھی
ایسا سفر کرے گی کسی کو خبر نہ تھی

وہ عزم تھا ترا کہ کسی سے نہ ٹل سکا
وہ زخم تھا کہ کوئی دوا کارگر نہ تھی

اے مادرِ شفیق سے مجھ پہ شفیق تر
میرے نصیب میں تری گردِ سفر نہ تھی

کیوں آ سکا نہ تیرے قدم چومنے کو میں
اتنی تو تیرے دل کی تڑپ بے اثر نہ تھی

کیسے سمٹ گئی تری شفقت کی داستاں
تیری تو کوئی بات کبھی مختصر نہ تھی

پُرہول وادیوں میں یہ تنہا سفر کا عزم
تو زندگی میں تو کبھی ایسی نڈر نہ تھی

میں آؤں آستاں پہ ترے اور تو نہ ہو
صورت یہ خواب میں بھی تو پیشِ نظر نہ تھی

دل پر گزر گئی جو قیامت وہ کیا کہوں
مانا کہ دیکھنے میں مری آنکھ تر نہ تھی

نوحہ

تنہائیوں کو دیدۂ پُر آب دے گئی
یعنی صدف کو گوہرِ نایاب دے گئی

دل پر کُھدی ہوئی وہ تری صورتِ شفیق
بے خواب ساعتوں کے لیے خواب دے گئی

خود ہو گئی غروب، مگر میری آنکھ کو
اشکِ رواں کے انجمِ شب تاب دے گئی

خاکِ لحد میں ڈوبی ہوئی شفقتوں کی یاد
دریائے دِل کو گردشِ گرداب دے گئی

ہنستے ہوئے بھی دل میں رواں موجِ غم رہے
کیسے عجیب درد کے آداب دے گئی